طیبہ تحسین*

مسئلۂ فلسطین: محمّد اسد اور ایڈورڈ سعید کے دانش ورانہ مباحث

Muhammad Asad and Edward Said's Intellectual Perspective on the Question of Palestine.

Abstract:

Palestine has been the focus of political, intellectual, anthropological and moral debate for the last 78 years. The land of Palestine has a rich cultural history and strategic value. Palestine Problem is not only limited to the Middle East but has equal appeal to the intellectual class across the globe. Muhammad Asad (1900-1992) and Edward W. Said (1935-2003) are those intellectuals who lived in the Middle East for a period. They had a chance to observe the cultural and political landscape of Palestine quite closely. Both scholars expressed their views and opinions in their writings on Palestine. This paper aims at highlighting their perspectives and intellectual narratives.

Keywords: Palestine, Colonialism, Hegemony, *Toofan-se-Sahil Tak*, The Question of Palestine, After the Last Sky.

محمّد اسد (۱۹۰۰ء-۱۹۹۲ء) ایک آسٹروی نژاد نو مسلم مفکر تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی ایک یہودی کے طور پر گزری۔ پیشے کے اعتبار سے وہ صحافی تھے۔ بعد ازاں قبولِ اسلام کی سعادت حاصل کر کے انھوں نے اپنی تمام تر دانش ورانہ صلاحیتیں احیائے ملت کے لیے وقف کر دیں۔ وہ پہلے پاکستانی تھے جنھیں پاکستانی پاسپورٹ کا اجرا کیا گیا۔ محمد اسد کی اہم تصانیف میں *Islam at the Crossroads* اور *The Road to Mecca* کے علاوہ *This Law of Ours and Other Essays* اور قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ *The Message of the Quran* شامل ہیں۔ محمد اسد ان دانش وروں میں سے تھے جن پر ملت اسلامیہ اور بالخصوص پاکستان کی ملت فخر کر سکتی ہے۔

ایڈورڈ سعید (۱۹۳۵ء-۲۰۰۳ء) یروشلم میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم بیت المقدس اور مصر کے اسکولوں سے

حاصل کی۔ پھر وہ امریکا چلے گئے جہاں کولمبیا یونیورسٹی میں انگریزی ادب کی تدریس کرتے رہے۔ ایڈورڈ سعید، فلسطین کے مسئلے کے حل کے لیے بہت پر جوش تھے۔ ان کی اہم ترین کتابوں میں *Orientalism* اور *Culture and Imperialism* کے علاوہ *The Question of Palestine* اور *Out of place* (جوان کی خود نوشت ہے) شامل ہیں۔

محمّد اسد اور ایڈورڈ سعید دو ایسی شخصیات ہیں جن کے ہاں زمانی بعد کے باوجود افکار و خیالات کی حیرت انگیز مماثلت نظر آتی ہے۔ اور یہ مماثلت حریّتِ فکر، انسانی حقوق اور استشراق یا مشرق شناسی کے علاوہ ایک اور اہم موضوع کو بھی محیط ہے۔ میری مراد فلسطین سے ہے۔ اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ دونوں شخصیات کا دائرہ کار مختلف تھا اور پیرایۂ اظہار بھی تاہم دونوں کے ہاں مشرق وسطیٰ کی اہمیت اور اس کے مسائل کے ضمن میں ایک نوعیت کی یکسانیت واضح ہے۔

مسئلہ فلسطین کا تعلق بیسویں صدی کے اوائل سے جاری تاریخی و سیاسی تنازع ہے جو مشرق وسطیٰ میں واقع بیت المقدس کی سرزمین کے آس پاس جنم لینے والا ایک ایسا قضیہ ہے جو فلسطینی مسلمانوں اور صیہونیت کے پیروکاروں (اسرائیلیوں) کے درمیان گزشتہ تقریباً آٹھ دہائیوں سے چل رہا ہے۔ سلطنت برطانیہ کی پشت پناہی سے ۱۹۴۸ء میں فلسطینیوں کو ان کی سرزمین سے بے دخل کر کے ریاست اسرائیل کی بنیاد رکھی گئی۔ اس عمل کو فلسطین نے "النکبۃ" (تباہی، بدبختی) کا نام دیا تھا۔ ۱۹۶۷ء کی سات روزہ عرب اسرائیل جنگ کے بعد اسرائیل نے شام کے کچھ علاقے مثلاً گولان کی پہاڑیوں، غزہ کے علاقے، مغربی کنارے وغیرہ پر اپنا تسلط قائم کر کے اپنے قبضے کا دائرہ کار مزید بڑھا دیا۔ فلسطینی اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرتے ہیں تو اسرائیلی ظلم اور پابندیوں کا سامنا کرتے ہیں۔ اس علاقے کی مزید اہمیت لیے بھی ہے کہ یہاں مسلمانوں کا قبلہ اول واقع ہے۔ اس مسئلے کا تاحال کوئی منصفانہ حل پیش نہیں کیا جاسکا۔

اس سے متعلق لکھنے والے مغربی مفکرین کی بھی کمی نہیں، ان کا نقطہ نظر کافی حد تک دلائل پر مبنی اور حقیقت پسندانہ ہے۔ انھی میں سے چند ایک کی آراء ملاحظہ کیجیے، مائیکل سکاٹ بومین (Michael Scot -Baumann) کہتا ہے:

> زیادہ تر مہاجرین غریب اور بے روزگار ہی رہے۔ پناہ گزین کیمپوں میں انھوں نے اسرائیل کی سرحدوں کے گرد انسانی بدحالی کا ایک حلقہ سا تشکیل دے دیا۔ تنگ اور بھیڑ بھاڑ والے حالات میں اکٹھے رہنے کے باعث وہ شدید مایوسی اور تلخی کا شکار ہو گئے۔ اس لیے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ فلسطینی قوم پرستی کو سب سے زیادہ مضبوط حمایت انھی کیمپوں میں حاصل ہوئی۔۔۔۔ یقیناً فلسطینیوں کو، جو شکست خوردہ، بے گھر اور بے وطن ہو چکے تھے، اس عظیم سانحے کی شدت کو تسلیم کرنے میں کئی سال لگے، کیوں کہ اس وقت ان کی سب سے بڑی اور فوری ترجیح صرف جسمانی بقا تھی۔[۱]

مائیکل سکاٹ اس اقتباس میں فلسطینی مہاجرین کی بے بسی اور ادبار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ بیشتر پناہ گزین غریب

اور بے روزگار ہی رہے۔ اپنے مہاجر کیمپوں میں جو اسرائیل کی سرحدوں کے آس پاس واقع ہیں، انھوں نے انسانی بے بسی کے تانے بانے بن رکھے ہیں، چناں چہ یہ مقامِ حیرت نہیں جب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ مہاجر کیمپ فلسطینی قوم پرستی کی سب سے توانا آواز بن کر ابھرے۔۔۔۔ حتمی طور پر شکست خوردہ، بے وطن اور بے ریاست فلسطینی مہاجروں کو اپنے اوپر پڑنے والی افتاد کا صحیح معنوں میں اندازہ لگانے میں کئی برس لگے کیوں کہ وہ تو اپنی جسمانی بقا کی جنگ میں پوری طرح مصروف تھے۔

کئی مصنفین نے تحریر کے ساتھ ساتھ تصاویر کو بھی دستاویزی ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان دستاویزات کی مدد سے واضح ثبوت ملتے ہیں کہ فلسطین کا مسئلہ پیچیدہ نہیں، سادہ ہے طاقت کا توازن البتہ درست نہیں۔ جارح طاقت اور مظلوم قوم کے مابین فرق ہر اعتبار سے موجود ہے۔ مشہور برطانوی صحافی ڈیوڈ گلمور (David Gilmour۔ پ: ۱۹۵۲ء) طاقت کے عدم توازن کے ضمن میں یوں رقم طراز ہے:

> وزیرِ اعظم نے کہا کہ اسرائیل کا عرب علاقوں کی ایک انچ زمین بھی اپنے ساتھ ملانے (الحاق کرنے) کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ لیکن صرف تین ہفتے بعد عربی یروشلم اور اس کے گرد و نواح کے دیہات کا باضابطہ طور پر اسرائیل میں الحاق کر لیا گیا۔ دو سال بعد مغربی کنارہ (ویسٹ بینک) اور غزہ میں آبادکاری (نو آبادیاتی بستیوں کے قیام) کا عمل شروع کر دیا گیا، اور چودہ سال بعد شام کی گولان کی پہاڑیوں کو اسرائیل کا حصہ قرار دے دیا گیا۔[۲]

مندرجہ بالا اقتباس میں گلمور اس بات کی یہ صراحت بیان کر رہا ہے کہ اسرائیلی وزیر اعظم کا یہ کہنا تھا کہ ان کا ایسا کوئی ارادہ دور دور تک نہیں کہ وہ عرب سرزمین کے ایک فٹ رقبے کو اپنی ریاست میں ضم کر لیں. مگر محض تین ہی ہفتے کے اندر اندر عرب یروشلم اور اس کے ارد گرد کے دیہات اسرائیلی ریاست میں ضم کر دیے گئے، دو برس بعد مغربی کنارے اور غزہ کے جبری انضمام کا آغاز کیا گیا، اور چودہ سال بعد شام کے علاقے گولان کی پہاڑیوں کے بھی اسرائیل کا حصہ ہونے کا رسمی اعلان کر دیا گیا۔

مغربی مفکرین اس امر کے مؤید ہیں کہ اسرائیل نے "جس کی لاٹھی، اس کی بھینس" پر عمل کرتے ہوئے فلسطین کے بیشتر علاقوں پر جبراً اپنا استحقاق قائم کیا اور وہاں کے اصل باشندوں کو نکال باہر کیا، وہ اس بات کے بھی داعی ہیں کہ اصل باشندوں کا ان کی سرزمین پر استحقاق فائق ہے۔ انھیں یہ حق ملنا چاہیے۔ ایسا ہی ایک مفکر پروفیسر الان پاپے (Ilan Pappe۔ پ: ۱۹۵۴ء) ہے جو بہ ذات خود اسرائیلی ہے تاہم وہ فلسطینی موقف کی تائید کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہے:

> چھپن (۵۶) برس سے زیادہ عرصے تک جسے 'امن کا عمل' (Peace Process) کہا جاتا رہا—جو در حقیقت ایک ایسا عمل تھا جو کسی منزل تک نہ پہنچا—وہ دراصل امریکا اور اسرائیل کی مشترکہ کوششوں کا ایک سلسلہ تھا، جس پر فلسطینیوں سے صرف ردِ عمل ظاہر کرنے کی توقع کی جاتی تھی۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ 'امن' کے اس تصور کی جگہ نو آبادیاتی تسلط کے خاتمے (Decolonization) کو مرکزی حیثیت دی جائے، اور

فلسطینیوں کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ خود خطے کے مستقبل کے بارے میں اپنا وژن اور نقطۂ نظر پیش کر سکیں۔ [۳]

الان پاپے کا یہ کہنا ہے کہ گزشتہ چھپن برس میں جس شے کو "امن کے عمل" کا نام دیا جاتا رہا وہ اصلاً امریکا اور اسرائیل کا تخلیق کردہ ایک سلسلہ تھا جس کا حاصل کچھ بھی نہ تھا اور جس پر فلسطینیوں کو ردِ عمل دینے پر اکسایا جاتا رہا۔ اب وقت آ چکا ہے کہ "امن" کو "غیر استعماریت" سے تبدیل کیا جائے اور فلسطینیوں کو یہ موقع دیا جائے کہ وہ اپنے مافی الضمیر کا کھل کر اظہار کریں۔

ان مغربی مفکرین کی فہرست خاصی طویل ہے جو مسئلہ فلسطین کو منصفانہ انداز میں دیکھتے اور اس کا قطعی معروضی انداز میں تجزیہ کرتے ہیں۔ ان مغربی مفکرین میں ڈاکٹر گیبور ماتے (Gabor Mate۔پ:۱۹۴۴ء)، گدیون لیوی (Gideon Levy۔پ:۱۹۵۳ء)، بنی مورس(Benny Morris۔پ:۱۹۴۸ء)، میکو پیلد(Miko Peled۔پ:۱۹۶۱ء) اور نوم چومسکی(Noam Chomsky۔پ:۱۹۲۸) کے نام اہم ہیں۔

ارضِ فلسطین، مسئلہ فلسطین دونوں مصنّفین کے ہاں ایک اہم موضوع ہے۔ گزشتہ اٹھتّر (۷۸) برس میں فلسطین اور اس سے وابستہ مسائل و معاملات کی اہمیّت دوچند ہو چکی ہے۔ خاص طور پر سات اکتوبر ۲۰۲۳ء کے بعد کا منظر نامہ۔ ارضِ فلسطین اور مسئلہ فلسطین کو انتہائی اہمیّت کے حامل معاملات کے ذیل میں لے آیا ہے۔ دنیا اس مسئلے پر دو گروہوں میں منقسم تھی مگر اب واضح اکثریت، فلسطین کے اصل باشندوں کے ساتھ اظہارِ یک جہتی کرتی نظر آ رہی ہے۔ گزشتہ سوا دو برس میں بہت کچھ بدل گیا ہے اور رائے عامہ اہلِ فلسطین کے حق میں ہموار ہوتی ہوئی دکھائی دی ہے۔ بہ قول آصف محمود:

> فلسطین کا مقدّمہ کوئی کمزور اور جذباتی بیانیہ نہیں ہے، یہ استدلال پر استوار ایک مضبوط مقدمہ ہے اور بین الاقوامی قانون اس کی پشت پر کھڑا ہے۔ فلسطین کے باب میں، مگر یہ قانون اپنی قوّتِ نافذہ سے محروم نظر آتا ہے اور اس نے بین الاقوامی قانون کے ساتھ ساتھ خود اقوام متّحدہ کے وجود اور افادیت پر بہت سنجیدہ سوال اٹھا دیے ہیں۔ [۴]

محمد اسد نے پہلی بار ارضِ فلسطین کا سفر ۱۹۲۲ء میں اختیار کیا۔ پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء-۱۹۱۸ء) کی ہولناکیوں کے اثرات دنیا کے بیشتر ممالک پر اب تک باقی تھے، اگرچہ جنگ کو ختم ہوئے چار برس بیت چکے تھے۔ پہلی عالمی جنگ نے انسان کی شخصیت کے بدترین پہلوؤں کو عیاں کر دیا تھا۔ آگ اور خون کے دریا تھے جو یہ چار برسوں پر محیط جنگ اپنے پیچھے چھوڑ کر گئی، نہ صرف یہ بل کہ دو دہائیوں کے بعد ایک مزید بڑی جنگ کی جڑیں اسی پہلی عالمی جنگ میں پیوست تھیں۔ ایک حسّاس اور دردِ دل رکھنے والے شخص کے لیے یہ جنگ بہت سے سوالات کو جنم دے گئی۔ محمّد اسد اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> جنگ اور پھر اس کے بعد بہت فنکارانہ طریقے سے تراشے ہوئے نِت نئے اصولوں کی مختلف اور متضاد آوازوں کی وجہ سے ضمیر و دماغ میں ایک زبردست کشمکش برپا ہے، ہماری مشینیں اور آلات اور آسمان سے

سرگوشیاں کرنے والی عمارتیں، ہماری پاش پاش اور ریزہ ریزہ روح کو پھر سے جوڑنے میں بالکل ناکام ثابت ہوئی ہیں، اس کے باوجود میں اپنے دل میں کہتا تھا کہ کیا یورپ کی روحانی عظمت کی حقیقت ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی ہے، کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ غلطی کا پتہ لگا کر تھوڑی بہت کھوئی ہوئی عظمت اور قیمت کو واپس لایا جا سکے؟[۵]

پہلی عالمی جنگ نے افراد و معاشرہ، ہر دو کے اذہان و قلوب پر اپنے ان مِٹ نقوش ثبت کیے۔ ہزاروں بے گناہ لوگ جنھیں معلوم بھی نہ تھا کہ جنگ کا نقطۂ آغاز کیا تھا، لقمۂ اجل بن گئے۔ برطانوی استعمار نے اپنی اپنی نو آبادیات (Colonies) سے لاکھوں کی تعداد میں لوگوں کو محاذِ جنگ پر بھجوایا جن میں سے ایک بڑی تعداد جنگ میں کام آئی۔ بہ قول شاعر:

یہ خونِ خاک نشیناں تھا، رِزقِ خاک ہوا![۶]

استعمار کے ہتھکنڈوں کا شکار وہ ممالک تھے جن کا اس جنگ کے آغاز سے کوئی تعلق تھا نہ اس کے اختتام سے لیکن یہ جنگ ختم ہوتے ہوتے دنیا بھر کو اپنے مسموم اثرات سے آلودہ کر گئی، ہر ملک، بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کا شکار ہوا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب سکونِ قلب کی تلاش میں محمدّ اسد نے، جو اس وقت لیوپولڈ ویس تھے، سفر مشرق اختیار کیا۔ اس حوالے سے سید ابوالحسن علی ندوی (۱۹۱۳ء-۱۹۹۹ء) لکھتے ہیں:

انھوں نے ۱۹۲۲ء میں بیت المقدس کا سفر کیا اور پہلی مرتبہ صحرائے سینا میں ٹرین میں سفر کرتے ہوئے اس عرب قوم اور عربی تہذیب کی جھلک دیکھی جس کو اسلام نے تہذیب واخلاق کے ایک نئے سانچے میں ڈھالا تھا، اور جو اس کے عقیدہ کی بدولت اب بھی اعلیٰ اخلاق اور زندگی کی حرارت dو لطافت کی مالک تھی، انھوں نے اس ذہین و حسّاس نوجوان کی حیثیت سے، جس کو قدرت نے اعلیٰ درجہ کی قوت مشاہدہ عطا کی ہو، اور وہ ایک نئی سرزمین اور ایک نئی دنیا میں قدم رکھ رہا ہو، ہر چیز کو غور سے دیکھا۔۔۔ انھوں نے بیت المقدس میں کئی مہینے گزارے اور عرب مسلمانوں کو ان کی زندگی کے مختلف و بے تکلّف مظاہرے کے ساتھ دیکھا، ان کی عبادت، معاشرت ہر چیز کا قریب سے مطالعہ کیا۔[۷]

محمدّ اسد نے مسلم تہذیب کا بہ نظر غائر مطالعہ انھی دِنوں شروع کیا جب وہ صحرائے سینا سے گزرتے ہوئے غزہ پہنچے جہاں ان کا ہم سفر بدّو ان کو الوداع کہہ کر رخصت ہو گیا۔ درحقیقت یہی شخص ان کے قبول اسلام کی پہلی کڑی تھا۔ اس کے حسنِ سلوک نے محمدّ اسد کو اسلام کی عالم گیریت کا پہلا سبق دیا۔ آگے چل کر وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ۱۹۲۲ء میں وہ اپنے ماموں کے گھر مقیم تھے جو بیت المقدس میں واقع تھا۔ اس امر سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ۱۹۲۲ء میں یہودی فلسطین کی سرزمین پر آباد ہو رہے تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے شروع ہونے سے ایک برس پہلے برطانوی استعمار کے ایک مہرے لارڈ آرتھر بالفور (Lord Arthur

Balfour ۱۸۴۸ء-۱۹۳۰ء) نے اعلانِ بالفور کے نام سے یہود کی ارضِ فلسطین میں آبادکاری کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ یہ ۱۹۱۷ء کی بات ہے جب خلافتِ عثمانیہ کا آخری حکمران سلطان عبد الحمید دوّم (۱۸۴۲ء-۱۹۱۸ء) معزول کیا جا چکا تھا۔ وہ یہود کے راستے کی آخری رکاوٹ تھا۔ فروری ۱۹۱۸ء میں سلطان عبد الحمید کا کسمپرسی کے عالم میں انتقال ہو گیا اور ۱۹۲۴ء میں باقاعدہ طور پر خلافت کا خاتمہ کر دیا گیا۔ یہ برس مسلم امّہ کے لیے بدترین تھے اور چند برسوں میں عالمی سیاست کا نقشہ مکمل طور پر بدل جانے کے آثار واضح ہو رہے تھے۔ یہی وہ دِن تھے جب محمّد اسد اپنے ایک رشتہ دار کے ہاں قیام پذیر تھے اور بیت المقدس کی زندگی کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> دن بھر بھاری بھر کم اونٹ وہاں پڑے رہتے تھے اور بہت لوگ ان کی خبر گیری میں مشغول اور منہمک رہتے تھے، ہاں موسلا دھار یا تیز بارش کے وقت سب لوگ اصطبل میں پناہ لینے کے لیے چلے جاتے تھے۔ وہ دیکھنے میں فقرا تھے۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس لیکن حقیقت میں آقاؤں کی طرح زندگی گزارتے تھے، جب وہ ایک ساتھ کھانے کے لیے زمین پر بیٹھتے اور تھوڑے سے پنیر یا زیتون کے دانوں کے ساتھ ساتھ روٹی کھاتے تو میں یہ منظر دیکھ کر ان کی عالی ہمّتی، شرافت، قوتِ برداشت اور ان کے اعتماد و سکون سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔[۸]

ایک اور جگہ محمّد اسد یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر آپ ان لوگوں کو دیکھتے تو یہ محسوس کرتے کہ وہ اپنا احترام اور زندگی کی قدر خود کرتے ہیں۔ محمّد اسد کا یہ مشاہدہ اس معاشرے کی ایک جھلک ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جہاں مسلمان غیور و جسور اور حریّت پسند تھے۔ (برسوں بعد محمّد اسد نے جب دوبارہ انھی علاقوں کا دورہ کیا تو وہ یہ جان کے دِل گرفتہ ہوئے کہ حجاز کی سرزمین تیل کی دولت سے مالا مال ہو چکی تھی اور پیٹرو ڈالرز کی ریل پیل نے حریتِ اظہار و افکار سے لبریز عربوں کو ڈرپوک اور سست بنا دیا تھا!) محمّد اسد کی زندگی کے یہ ہنگامہ خیز ایّام تھے۔ وہ مادیت پرست یورپ سے روحانیت پسند مشرقِ وسطیٰ کا تقابل بار بار کرتے تھے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> میں نے اپنے روبرو زندگی کا ایک ایسا مفہوم پایا جو میرے لیے یکسر نیا تھا۔ مجھے ایسے لگا کہ جیسے کوئی گرم حرارت انگیز روح ہے جو ان عربوں کے خون کے ساتھ ان کے افکار اور حرکات و سکنات تک میں سرایت کر گئی ہے۔ روحانی خراشوں اور اذیتوں سے نا آشنا۔۔، وہ اذیّتیں جنھوں نے خوف، حرص اور گھٹن کا بھوت بن کر مغربی زندگی کو بے حد بھدّا، بے ہنگم اور کریہہ المنظر بنا دیا تھا، جس سے اب کوئی خاص امید باقی نہیں رہ گئی تھی۔ میں عربوں میں وہ چیز پانے لگا جس کی غیر شعوری طور پر مجھے عرصے سے تلاش تھی...[۹]

۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۶ء، محمّد اسد کی زندگی کے ناقابلِ فراموش سال تھے۔ وہ ان برسوں میں بہت قریب سے مشرقِ وسطیٰ کی عام زندگی، لوگوں کے رویّوں، طرزِ حیات اور سیاست کے خم و پیچ کا مشاہدہ کرتے رہے۔ وہ اہلِ مشرق سے متعلّق، مغرب کے عمومی نقطۂ نظر کو بھی فراموش نہ کر پائے۔ وہ اپنے غیر معمولی مشاہدے کے بل پر یہ بات جان چکے تھے کہ مشرقِ وسطیٰ میں بسنے والی

قوموں پر یورپ کی ستم سے بھری پالیسیاں منافقت کے ساتھ جاری و ساری تھیں، اگر مشرقِ وسطیٰ کی اقوام صدائے احتجاج بلند بھی کرتیں تو اسے مسلمانوں کی دہشت گردی کا نام دیا جاتا۔ مسلمانوں کے مسائل اور خواہشات سے ان استعماری طاقتوں کو کوئی دِل چسپی نہ تھی۔ محمّد اسد نے یہ بھی دیکھا کہ ترقی و خوش حالی کے نام پر ان محکوم اقوام کی عزتِ نفس کو ٹھیس پہنچائی جاتی تھی اور ان کی حریت پسندی کو پامال کیا جاتا تھا۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> میں نے اوّل اوّل اس بات کو ۱۹۲۲ء میں فلسطین میں محسوس کرنا شروع کیا، یہ اس وقت کی بات ہے جب میں نے عربوں اور یہودیوں کے نزاع کے سلسلے میں برطانوی گورنمنٹ کی دورخی پالیسی کا عملاً مشاہدہ کیا، جب ۱۹۲۳ء میں فلسطین کے تمام مقامات کا دورہ کرنے کے بعد میں مصر واپس ہوا تو یہ بات کھل کر میرے سامنے آچکی تھی۔[۱۰]

محمّد اسد کے مشاہدات اور پیش بنی آنے والے سالوں میں بالکل واضح ہوگئی جب برطانوی انتداب(British Mandate) کے وقت فلسطین کی مسلم آبادی جو اصلاً ۹۳ فیصد تھی، رفتہ رفتہ کم ہوتی جارہی تھی۔ اس کی وجہ کیا تھی؟ محمّد آصف محمود اپنی تصنیف فلسطین بین الاقوامی قانون کے تناظر میں رقم طراز ہیں:

> پہلی جنگ عظیم کے بعد فلسطین میں یہودی آبادکاری کا بھرپور دور شروع ہوا اور فلسطین کو جب برطانوی اِنتداب میں دیا گیا تو یہ سلسلہ عروج پر جا پہنچا۔ مشرقی یورپ وغیرہ سے یہودیوں نے فلسطین کا رخ کیا اور یہاں ان کی آبادکاری میں انھیں عالمی قوتوں نے تعاون فراہم کیا۔ وجوہات جو بھی رہی ہوں، سوال یہ ہے کہ جب یہودی مشرقی یورپ وغیرہ سے نکلے تو انھیں فلسطین میں کیوں لایا گیا؟ اس اقدام کا کوئی قانونی اور اخلاقی جواز موجود ہے؟[۱۱]

مصنف نے ایک اہم سوال اٹھایا ہے جس کا جواب وہ خود ہی دیتے ہیں اور لکھتے ہیں:

> یورپ اور امریکا نے انھیں اپنے ہاں آباد کیوں نہ کرلیا؟ ان کے ساتھ اگر کہیں ظلم ہوا تھا تو اس میں فلسطین کا کیا قصور تھا؟ ان کے لیے اگر کہیں حالات ناسازگار تھے تو اس کا تاوان فلسطینیوں سے کیوں وصول کیا گیا؟ اگر انھیں نامساعد حالات سے نکالنا تھا تو یہ اقوام عالم کی ذمہ داری تھی یا یہ صرف اکیلے فلسطین کی ذِمہ داری تھی؟ لیگ آف نیشنز اور پھر اقوام متحدہ کے رکن ممالک انھیں اپنے ہاں کیوں نہ رکھ سکے؟ برطانیہ اور امریکہ نے ان کی میزبانی کیوں نہ فرمائی؟ کیا کسی کے پاس یہ قانونی اختیار تھا کہ وہ باہر سے لاکھوں یہودی لاکر انھیں جبری طور پر فلسطین میں آباد کردے؟ کیا انٹرنیشنل لا کے تحت یہ ایک جائز اقدام تھا کہ فلسطینیوں کی اجازت اور مرضی کے بغیر باہر سے اتنے یہودی لاکر آباد کردیے جائیں کہ مقامی آبادی کا تناسب ۹۳ فی صد سے کم ہوکر ۶۶ فی صد رہ جائے؟ اقوام متحدہ کے اعداد و شمار کے مطابق دنیا بھر نے اجتماعی طور جتنے یہودیوں

کو اپنے ہاں جگہ دی، اکیلے ایک فلسطین میں آباد کیے جانے والے یہودیوں کی تعداد اس سے زیادہ تھی۔[۱۲]

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں محمدؐ اسد کے مشاہدات ان کی بصیرت اور ژرف نگاہی کا ثبوت ہیں۔ اگرچہ وہ قبولِ اسلام کے بعد دوبارہ سرزمینِ فلسطین کا سفر نہ کر سکے تاہم وہ اتحاد بین المسلمین اور احیائے امت مسلمہ کے تمام عمر داعی رہے۔

ایڈورڈ سعید یروشلم میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم بیت المقدس کے اسکول میں ہوئی، بعد ازاں ان کے خاندان کو مہاجرت اختیار کرنا پڑی۔ وہ مصر اور بیروت میں بھی رہے اور پھر امریکا کو اپنا وطن بنایا جہاں عمر بھر درس و تدریس اور تحقیق و تصنیف کو اپنا شعار بنائے رکھا، یہیں ان کی وفات ہوئی لیکن یہ ایک اہم امر ہے کہ وہ عمر بھر فلسطین پر اسرائیل کے غاصبانہ قبضے کے خلاف اور فلسطینیوں کے حق میں لکھتے رہے۔ بل کہ یہ کہنا مبالغہ آرائی نہ ہو گا کہ فلسطینیوں کے حق میں وہ چند توانا آوازوں میں سے ایک تھے۔ اپنی بے خوفی کی قیمت بھی وہ عمر بھر ادا کرتے رہے۔ کولمبیا یونیورسٹی میں کئی بار انھیں اسرائیل نواز لابی کی جانب سے دھمکیوں، جاسوسی، دفتر کی تلاشی اور شدید تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن وہ اپنے موقف پر تاعمر قائم رہے۔ ایڈورڈ سعید فلسطینی قومی کونسل کے رکن بھی رہے۔ انھوں نے *The Question of Palestine* جیسی اہم کتاب لکھ کر فلسطینیوں کا مقدّمہ بھرپور انداز میں لڑا۔ یہ اتنی وقیع کتاب ہے کہ دنیا کی کئی بڑی زبانوں میں اس کے تراجم ہوئے۔ اردو میں اس کا ترجمہ پاکستان کے صفِ اوّل کے مترجم شاہد حمید (۱۹۲۸ء-۲۰۱۸ء) نے کیا۔ وہ اس کتاب کی اہمیت سے متعلق اپنے پیش لفظ میں فرماتے ہیں:

> آج جب پریس اتنی ترقی کر چکا ہے اور تو اور نقول کی تیار کرنے کی مشینیں ہر گلی نکڑ پر موجود ہیں، کتاب غائب کرانا اتنا مشکل نہیں۔۔۔۔ ایک طریقہ صیہونیوں نے اختیار کیا ہے۔ جونہی [جوں ہی] ان کے کانوں میں بِھنک پڑتی ہے کہ کوئی ایسی تصنیف بازار میں آئی ہے یا آنے والی ہے، وہ اس کی تمام کاپیاں خریدنے دوڑتے ہیں۔ کتاب تَلف ہو جاتی ہے اور اگر پبلشر مغربی ہے، تو پھر ترکش کے تمام تیر آزما کر اس کی مزید اشاعت رکوا دی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایڈورڈ سعید کی اس کتاب کے ساتھ بھی کچھ اِسی قسم کی واردات گزری ہے۔ راقم الحروف کو اپنے قیام لندن کے دوران میں کسی دکان پر بھی، نہ نئی نہ پرانی کتابیں بیچنے والی، اس کو کا کوئی نسخہ دستیاب نہ ہو سکا حتیٰ کہ Foyles میں بھی نہیں، جن کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ ہر وقت پچاس لاکھ کتابیں سٹاک میں رکھتے ہیں اور دنیا کے سب سے بڑے کتب فروش ہیں۔[۱۳]

ایڈورڈ سعید نے، جو اعلیٰ پائے کی عربی بولتے اور سمجھتے تھے، عرب دنیا کو دو حوالوں سے سمجھا: عربی تصنیفات اور مشرقِ وسطیٰ میں اپنے عربی بولنے والے دوستوں کی مدد سے۔ تیسرا حوالہ خود ان کا بچپن تھا جو فلسطین میں گزرا۔ ان کی والدہ ہلدیٰ موسیٰ اور والد ودیع سعید ابتدا ہی سے فلسطین میں رہتے آرہے تھے۔ سعید کی ابتدائی تعلیم بھی فلسطین ہی میں ہوئی۔ چناں چہ، مسئلۂ فلسطین سے ان کی جذباتی وابستگی کی کئی وجوہات تھیں۔ فرید حدّاد (۱۹۲۹ء-۱۹۵۹ء)، یاسر عرفات (۱۹۲۹ء-۲۰۰۴ء)، غسّان کنفانی (۱۹۳۶ء-

۱۹۷۲ء) اور حنان اشراوی (پ: ۱۹۴۶ء) سے ایڈورڈ سعید کی ذہنی قربت تھی نیز فلسطین کے مشہور شاعر محمود درویش (۱۹۴۱ء-۲۰۰۸ء) سے سعید کی دوستی اور گہری وابستگی تھی۔ محمود درویش کی مزاحمتی شاعری، فلسطینی جدوجہد کا اہم حوالہ ہے۔ اس تمام فضا میں ایڈورڈ سعید نے یہ کتاب لکھی جو پہلی بار ۱۹۷۹ء میں نیویارک سے شائع ہوئی۔ فلسطین کی تاریخ کے علاوہ اس میں صہیونیّت کے عنوان سے دوسرا باب قائم کیا گیا ہے۔ صہیونیت کو اس کے ستم رسیدگان کے نقطۂ نظر سے بیان کیا گیا ہے۔ اس باب میں سعید نے صہیونیت اور یورپی استعمار کے رویوں کا ذکر کیا ہے۔ صہیونیوں کی آبادی اور فلسطینیوں کی بربادی نیز معاہدۂ کیمپ ڈیوڈ کے بعد مسئلۂ فلسطین اس کتاب میں ''مسئلۂ فلسطین'' کے باب دوم بعنوان ''صیہونیوں کی آبادی، فلسطینیوں کی بربادی'' میں ایڈورڈ سعید لکھتے ہیں:

> صہیونیت کے متعلّق عام فلسطینیوں کا ردِّ عمل کیا تھا، میرے خیال میں اس کی ایک مکمل جھلک مندرجہ ذیل جملے میں مل جاتی ہے جو ۱۹۲۲ء میں سر وِنسٹن چرچل کے قرطاسِ اَبیض کے جواب میں عرب وفد نے استعمال کیا تھا: یہودیوں کا قومی وطن قائم کرنے کا نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ عربوں کی آبادی، ثقافت اور زبان یا توبالکل معدوم ہو جائے گی اور یا پھر یہ دوسروں کے ''رحم و کرم'' پر ہوگی، فلسطینی عرب جِس چیز کا نسل در نسل مشاہدہ کررہے تھے، وہ، وہ منصوبہ تھا جس کی گہری جڑیں یہودی تاریخ اور اس خوفناک تجربے میں جو انھیں یورپ میں ہوا، پیوستہ تھیں، جس کی گرہیں اب آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے کھلتی جارہی تھیں۔ عربوں کو اب یہ صاف صاف نظر آرہا تھا کہ صیہونی منصوبہ ایک مجسم سفاک نظریہ ہے جو خانقاہی ضبطِ نفس اور ماحول سے سرد مہرانہ بے تعلّقی کا حکم لگاتا ہے۔[۱۴]

محمّد اسد نے ۱۹۳۲ء میں بیت المقدس کے سفر کے دوران جو کچھ دیکھا تھا اور جو پیش گوئی کی تھی، وہ نہ صرف پوری ہوئی بلکہ ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے قیام کے بعد حالات بہت تیزی سے بدلنے لگے۔ فلسطینیوں (جن میں مسلمان اور عیسائی دونوں ہی شامل ہیں) کو بے گھری اور دربدری کا عذاب سہنا پڑا اور جو اپنے گھروں کو چھوڑ کر فوری طور پر مہاجرت اختیار نہ کرسکے اور اپنی آبائی سرزمین ہی پر قیام پذیر رہے، انھیں اہانت آمیز سلوک کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس تمام صورتِ حال پر سعید یوں رقم طراز ہیں:

> اپریل ۱۹۴۸ء میں مناچم بیگن اور اس کی دہشت پسند تنظیم ''ارگن'' کے ارکان نے جس بربریّت کا مظاہرہ کیا اور بالخصوص دیر یاسین گاؤں کے اڑھائی سو معصوم عرب باشندوں کے قتلِ عام جیسی جو بہیمانہ کارروائیاں سرانجام دیں، انھوں نے یقیناً اپنا اثر دکھایا لیکن اپنی تمام تر بہیمیّت اور سفاکی کے باوجود دیر یاسین کا سانحہ اس قسم کے قتلِ عام کے بے شمار سانحات میں صرف ایک سانحہ تھا جو جنگِ عظیم اوّل کے فوراً بعد وقوع پذیر ہونا شروع ہو گئے تھے اور جنھوں نے شعوری طور پر ایسے صہیونیوں کو جنم دیا جو اپنے آپ کو ان امریکیوں کے ہم پلہ قرار دیتے تھے جو مقامی ریڈ انڈین باشندوں کا قتل عام کیا کرتے تھے اور اس پر اپنی مسرت کا اظہار

کیا کرتے تھے۔ لیکن اغلباً اہم تر وہ تراکیب اور تنظیمیں تھیں جو ان غیر مسلح عرب باشندوں کو دور باش رکھنے کے لیے وضع کی اور تشکیل دی گئیں، جو (اکثر و بیشتر صورت میں) ایک مرتبہ جنگ کی تباہ کاریوں اور سفاکیوں سے بچنے کے لیے اپنے اپنے گھروں کو خیر باد کہہ گئے تھے۔[۱۵]

سعید نے ان خیالات کا اظہار اپنی دوسری کتاب *After the Last Sky* میں بھی کیا ہے۔ یہ کتاب "مسئلۂ فلسطین" سے اس اعتبار سے کچھ مختلف ہے کہ اس میں ایک فوٹو گرافر ژاں موہر (Jean Mohr۔ ۱۹۲۵ء-۲۰۱۸ء) کی بنائی ہوئی تصاویر شامل ہیں۔ یہ تصاویر خود پکارتی ہیں کہ فلسطینیوں کی در بدری کا عذاب ان کا خود مسلط کردہ نہیں۔ *After the Last Sky (Palestinian Lives)* میں سعید نے کھل کر فلسطینی مسئلے پر آواز بلند کی ہے۔ یہ کتاب مسئلۂ فلسطین کے شائع ہونے کے بیس برس بعد ۱۹۹۹ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئی تھی۔ اس دوران پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا تھا۔ ایڈورڈ سعید کو PLO کے کردار اور اس کے بانی یاسر عرفات کی پالیسیوں سے بہت سے اختلافات جنم لے چکے تھے جن کا وہ کھل کر اظہار کرتے ہیں۔ وہ بہت صراحت سے اس بات کو بیان کرتے ہیں کہ عرب ممالک میں ایک بے حسی اور بے حمیّتی ہے جس کے سبب وہ کھل کر فلسطین کا ساتھ نہیں دیتے، وہ کہتے ہیں کہ لوگوں کی نظر میں مسئلۂ فلسطین اب پرانا ہو چکا، کچھ نیا اور اچھوتا لکھنے کی ضرورت ہے۔ یوں ایڈورڈ سعید نے عالمی ضمیر کو متاثر کرنے کی اپنی سی سعی کی ہے۔

اس کتاب میں کیمپوں میں پناہ گزین فلسطینی خاندانوں کی تصاویر اور ایڈورڈ سعید کے تاثرات کسی بھی دردِ دل رکھنے والے شخص کے لیے ایک دکھ بھری داستان کا بیان ہیں۔ کتاب میں جن جگہوں کا ذکر ہے ان مقامات میں یروشلم، غزہ، ناصرہ (Nazareth)، تل شیوا (Tel Sheva)، رَمّلہ، الخلیل اور لبنان کے مہاجر کیمپوں کی تصاویر اور کہانیاں ہیں۔ ان مہاجر کیمپوں میں سبھی لوگ کسمپرسی کی تصویر بنے نظر آرہے ہیں۔ وہ لوگ جنھیں محمّد اسد نے سفر مشرقِ وسطیٰ کے دوران اشراف اور معزّز لوگ کہا تھا، اب ایک پست درجے کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ تاریخ کا جبر ایک اذیّت ناک شے ہے۔

حکیم الامّت علامہ محمد اقبال (۱۸۷۷ء-۱۹۳۸ء) نے اپنی ایک نظم بعنوان "شام و فلسطین" میں اس حوالے سے بہت اہم نکات اٹھائے ہیں:

رندانِ فرانسیس کا مے خانہ سلامت
پر ہے مئے گلرنگ سے ہر شیشہ حلب کا
ہے خاکِ فلسطیں پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق کیوں نہیں اہلِ عرب کا

مقصد ہے ملوکیّتِ اِنگلیس کا کچھ اور
قصّہ نہیں نارَنج کا یا شہد و رطب کا![۱۶]

تھیوڈور ہرزل (Theodor Herzl۔۱۸۶۰ء-۱۹۰۴ء)، آرتھر بالفور (Lord Arthur Balfour۔۱۸۴۸ء-۱۹۳۰ء)، لارڈ روتھ چائلڈ (Lord Rothchild۔۱۹۱۰ء-۱۹۹۰ء)، جنرل ایلن بی (General Allenby۔۱۸۶۱ء-۱۹۳۶ء)، ڈیوڈ بن گوریان (David Ben Gurion۔۱۸۸۶ء-۱۹۷۳ء) محض نام نہ تھے، یہ سبھی ایک خونچکاں داستان کا سفّاک و شاطر باب ہیں۔ اقبال ہی نے فرمایا تھا:

فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے![۱۷]

پنجۂ یہود نے جبراً اپنے حق میں فیصلے لکھوائے، دنیا بھر کے یہود کو لا کر ارضِ فلسطین میں آباد کیا گیا، اسرائیل کے نام سے ایک صہیونی ریاست کا قیام عمل میں لایا گیا جس کی پارلیمنٹ کی عمارت پر اس کے عزائم "حدودك يا اسرائيل: مِنَ الفرات اِلَى النِّيل" کے الفاظ میں درج ہیں اور جو دنیا بھر کی معیشت پر اپنا تسلط جمائے ہوئے ہے۔

ایڈورڈ سعید نے اپنی تیسری تصنیف بعنوان: *The End of Peace Process: Oslo and After* میں فلسطینی رہنماؤں کے غیر متحرک کردار، مغرب کے منافقانہ رویّوں اور اسرائیل کی چال بازی اور دسیسہ کاریوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ اوسلو امن معاہدہ در حقیقت کسی قسم کے امن کا ضامن نہ تھا۔ ایڈورڈ سعید نے واضح الفاظ میں کہا کہ فلسطین کے معاملے کے حل کے لیے کسی غیوّر اور بے غرض شخص کی ضرورت تھی۔ یاسر عرفات کی انا اور ہر معاملے میں اپنی ذات کو نمایاں کرنے کی خواہش نے PLO سمیت تمام فلسطینی کاز کو شدید نقصان پہنچایا۔ سعید کے الفاظ میں:

> اگر فلسطینی اتھارٹی، یاسر عرفات کی قیادت میں، اسی قسم کا امن حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، تو پھر ہمیں اسے اس کے اصل نام سے پکارنا چاہیے: ایک انتشار زدہ، غیر منظم اور منافق۔[۱۸]

سعید نے جہاں بل کلنٹن حکومت کی اسرائیل کی پشت پناہی کو نشانۂ تنقید بنایا ہے، وہاں وہ بار بار یاسر عرفات کی خود پسندی، انانیت اور بزعمِ خود "صاحبِ بصیرت" ہونے کی خوش فہمیوں پر بھی تنقید کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ اس بات کا اعادہ بھی کرتے ہیں کہ مسلم عرب دنیا مجموعی طور پر ایک نسیان کا شکار ہے۔ وہ تاریخ سے کچھ بھی سیکھنا پسند نہیں کرتی۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اوسلو معاہدے کی شِقوں کا ضرورت سے زیادہ طویل اور پیچیدہ ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ قانونی موشگافیوں میں الجھا کر اپنے مقاصد حاصل کیے جا سکیں تاہم یہ معاہدہ دیرپا امن کا ضامن ہرگز نہیں۔ سعید نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ اگر عراق نے صرف سات ماہ کویت پر اپنا ناجائز قبضہ قائم رکھا تو اسے عالمی عدالت کی جانب سے جرمانوں، سزاؤں اور پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یہی کلیہ اسرائیل پر لاگو کیوں نہیں ہوتا جہاں ایک بڑی طاقت عشروں سے ایک ایسے دوسرے ملک پر قابض ہے جو در حقیقت اس کا اپنا نہیں؟ سعید

نے یہ بات بھی ببانگِ دہل کہی ہے کہ اسلامی دہشت گردی کا الزام لگانے والا مغرب یہ کیوں نہیں بتلاتا کہ یہ دراصل ردِّ عمل تھا صدیوں کی مغربی استعماریت کا جو وہ مشرق کی سرزمین پر روا رکھے رہا۔ حماس کن حالات میں بنی اور کس امر کے رَدِّ عمل میں، نہ تو کوئی یہ بتاتا ہے نہ ہمیں اس پر بات کرنے کی اجازت ہے۔ سعید نے نیلسن منڈیلا، نیتن یاہو اور یاسر عرفات کے حوالے سے ایک پورا باب قلم بند کیا ہے۔ وہ نیلسن منڈیلا کو قابلِ تحسین گردانتے ہیں۔ جنوبی افریقہ کی آزادی کے لیے حریّت پسند منڈیلا کی کوششوں اور طویل جدوجہد کو سراہتے ہیں۔ وہ افریقیوں کی نسل کشی اور رنگ کی بنیاد پر ان سے امتیازی سلوک کے ضمن میں بھی نیلسن منڈیلا کی کوششوں کی تعریف کرتے ہیں۔ نیلسن منڈیلا نے کھل کر فلسطینی قوم کا ساتھ دیا۔ یہ امر قابلِ مسّرت تھا کہ اکتوبر ۲۰۲۳ء میں بھی جنوبی افریقہ نے کھل کر اہلِ فلسطین کی حمایت کی۔ جنوبی افریقہ ان چند ممالک میں سے ایک ہے جنھوں نے اسرائیل کی انسان دشمنی اور سفاک اور جارح پالیسیوں کو ہدفِ تنقید بنایا اور فلسطینیوں سے یک جہتی کا کامل اظہار کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ فلسطین کے لیے جس قدر سوزِ دل اور خلوص سے ایڈورڈ سعید نے لکھا، کم ہی دانش ور ہیں جنھوں نے اس بے باکی اور دلیری کا مظاہرہ کیا اور پھر وقتاً فوقتاً اس کی قیمت بھی ادا کی۔ فلسطین کا مسئلہ ایڈورڈ سعید کے لیے ایک جذباتی معاملے کی طرح ہے، اسی لیے اس موضوع پر لکھتے ہوئے ان کا قلم شمشیرِ براں بن جاتا ہے۔

۲۰۲۶ء میں صورتِ حال پہلے سے کہیں زیادہ دگر گوں ہو چکی۔ جس Collective Amnesia یا اجتماعی نسیان کی طرف سعید نے اشارہ کیا تھا، عرب دنیا اس کا پہلے سے زیادہ مظاہرہ کر رہی ہے۔ حریّت پسند تحریکوں کی جدوجہد ہنوز جاری ہے۔ بہ قولِ اقبال:

دیکھیے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا![19]

اقبال کے اس رجائیت افزا شعر کے بعد ایڈورڈ سعید کی تصنیف *After the Last Sky* کے ایک امید افروز اقتباس پر اس مضمون کا اختتام ہو گا۔ بہ قولِ سعید، دنیا اب فلسطینیوں کے وجود کو اسرائیلی / صہیونی پُرا پیگنڈے سے ہٹ کر دیکھتی ہے:

> بنیادی حقیقت بہر حال یہی ہے کہ ہم ایک ایسی قوم ہیں جس کی اپنی کوئی سرزمین نہیں۔ لیکن ہماری تاریخ میں پہلی بار فلسطینیوں کو بحیثیتِ فلسطینی اس انداز میں دیکھا جا سکتا ہے کہ وہ ایک نئے ماحول میں اپنی قومی شناخت اور خود آگاہی کے ساتھ گویا خود اپنی تشکیل کر رہے ہیں۔ فلسطینی قومی شعور کی یہ نئی کیفیت ہر فرد کو متاثر کر رہی ہے۔ اس خود تشکیلی کے نمایاں اثرات سامنے آئے ہیں۔ اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ صہیونیت کی جزوی اور تفصیلی حکمتِ عملی، نیز اپنی بقا کے لیے اختیار کردہ اس کے ڈرامائی حفاظتی اقدامات، کمزور پڑتے دکھائی دیتے

ہیں اور فلسطینی وجود اور اس کی موجودگی کی وضاحت کرنے کے لیے ناکافی محسوس ہوتے ہیں۔[۲۰]

یہ حقیقت ہے کہ دنیا مسئلۂ فلسطین کے باب میں یک سو ہو چکی، دنیا بھر میں ارضِ فلسطین کے ضمن میں توانا آوازیں بلند ہو رہی ہیں اور محمّد اسد اور ایڈورڈ سعید کا فلسطین ایک بار پھر عالمی توجہ اور حکمت عملی کو اپنی جانب مبذول کرا رہا ہے۔

اگر ہم محمد اسد اور ایڈورڈ سعید کے افکار کا مطالعہ نظر غائر کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ دونوں مصنفین کے ہاں سرزمین فلسطین کے لیے ایک گہری وابستگی ہے۔ یہ قدرِ مشترک اس سبب سے ہے کہ محمد اسد جو مذہباً یہودی تھے، قبولِ اسلام کے بعد مشرق وسطیٰ کی سرزمین سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ اگرچہ ان کی جائے ولادت آسٹریا تھی مگر نظریاتی طور پر ان کی تقدیس کا مرجع فلسطین کی سرزمین تھا۔ آنے والے برسوں میں حالات کیا رخ اختیار کریں گے، اس کی دھندلی سی تصویر انھیں دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے برعکس ایڈورڈ سعید اگرچہ مذہباً عیسائی تھے لیکن ان کی پیدائش یروشلم کے مقام پر ہوئی۔ ان کا تمام تر بچپن اور لڑکپن فلسطین اور مصر میں گزرا، اس لیے ان کی جغرافیائی و جذباتی وابستگی اس سرزمین سے اٹوٹ تھی۔ مزید یہ وجہ بھی تھی کہ ایڈورڈ سعید نے اپنی جوانی کے ایام میں عرب اسرائیل جنگ اور اس کے اثرات کا بہ غور مشاہدہ کیا، یاسر عرفات کی جدوجہد آزادی کا عمیق مطالعہ کیا نیز" اوسلو امن معاہدے " کی باریکیوں کو بھی بہ چشم غائر دیکھا۔ اس لیے انھوں نے *After the Last Sky*، *The Question of Palestine* اور *The End of the Peace Process: Oslo and After* جیسی وقیع کتابیں لکھیں۔ زمانی اعتبار سے محمد اسد اور ایڈورڈ سعید کے مابین خاصا بعد پایا جاتا ہے مگر نظریاتی طور پر دونوں فلسطینی نقطۂ نظر کی تائید کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

آخر میں اس بحث کو سمیٹتے ہوئے یہ کہا جا سکتا کہ مسئلہ فلسطین سات دہائیوں سے زائد عرصے پر محیط ایسا مسئلہ بن چکا ہے جو لاینحل تو نہیں کہا جا سکتا مگر اس کا واضح حل دونوں فریقوں کی باہمی رضامندی کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ مسئلہ جبر و تشدد کے ذریعے حل نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اکتوبر ۲۰۲۳ء کے بعد سے دنیا واضح طور پر فلسطینی جدوجہد کی معترف ہی نہیں بل کہ مددگار بھی نظر آتی ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جو ہمیں اپنے دونوں مذکورہ مفکرین کے ہاں ملتا ہے۔

حواشی و حوالہ جات

* (پ: ۱۹۸۳ء)، لیکچرر شعبۂ اردو، گورنمنٹ اسلامیہ گریجوایٹ کالج، ریلوے روڈ، لاہور۔

۱۔ مائیکل سکاٹ بومین [Michael Scot -Baumann]، *Palestinians and Israelis: A Short History of Conflict* (گلوسیسٹر شائر: دی ہسٹری پریس، ۲۰۲۱ء)، ۶۲۔

اصل متن:

> Most refugees remained poor and unemployed. In the camps they formed a ring of human misery round the borders of Israel. Crowded together, they become frustrated and bitter. Not surprisingly, it was in the camps that Palestinian nationalism found its strongest support... Certainly, it took many years for the Palestinians-defeated, displaced and stateless - to acknowledge the extent of the disaster that had befallen them, while physical survival was their overriding preoccupation.

۲۔ ڈیوڈ گلمور [David Gilmour]، *Dispossessed: The Ordeal of the Palestinians* (لندن: سایجوک اینڈ جیکسن لمیٹڈ، ۱۹۸۰ء)، ۲۱۷۔

اصل متن:

> Israel, said the prime minister, had no intention of annexing even one foot of Arab territory'. Three weeks later Arab Jerusalem and the surrounding villages were formally annexed, two years later the colonization of the West Bank and Gaza was begun, and fourteen years afterwards the Syrian Golan Heights were declared a part of Israel.

۳۔ اصل متن:

> For more than 56 years, what was termed the Peace Process - a process led nowhere -was actively a series of American Israeli initiatives to which the Palestinians were asked to react. Today, "Peace must be replaced with decolonization, and Palestinians must be able to articulate their vision for the region... .

دیکھیے: https://newleftreview.org تاریخ ملاحظہ: ۲۰ مارچ ۲۰۲۶ء۔

۴۔ محمد آصف محمود، فلسطین بین الاقوامی قانون کے تناظر میں (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۲۴ء)، ۷۔

۵۔ محمد اسد، طوفان سے ساحل تک (کراچی: مجلسِ نشریاتِ اسلام، ۱۹۹۷ء)، ۱۰۸۔

۶۔ ایضاً، ۱۶۔

۷۔ فیض احمد فیض، نُسخہ ہائے وفا "لہو کا سراغ" (لاہور: کارواں پریس، س۔ن)، ۳۴۹۔

۸۔ محمد اسد، طوفان سے ساحل تک، ۱۰۰۔

۹۔ ایضاً، ۱۰۶۔

۱۰۔ ایضاً، ۱۱۱۔

۱۱۔ محمد آصف محمود، فلسطین بین الاقوامی قانون کے تناظر میں، ۵۴۔

۱۲۔ ایضاً، ۵۴۔

۱۳۔ ایڈورڈ سعید، مسئلۂ فلسطین (جہلم، بک کارنر جہلم، ۲۰۲۱ء)، ۱۳۔

۱۴۔ ایضاً، ۱۶۳۔

۱۵۔ ایضاً، ۱۹۱۔

۱۶۔ محمدّ اقبال، کلیاتِ اقبال (ضربِ کلیم) (لاہور: اقبال اکادمی، ۱۹۹۴ء)، ۶۶۸۔

۱۷۔ ایضاً، ۶۷۱۔

۱۸۔ ایڈورڈ سعید [Edward Said]، *The End of the Peace Process* (نیویارک: و نٹیج بکس، ۲۰۰۱ء)، ۱۸۔

اصل متن:

> If this is the kind of peace that Palestinian Authority under Arafat is able to achieve, then we should call it by its real name: a protracted, disorderly, hypocritical and undignified surrender.

۱۹۔ محمدّ اقبال، کلیاتِ اقبال (بالِ جبریل)، ۴۲۷۔

۲۰۔ ایڈورڈ سعید [Edward Said]، *After the Last Sky (Palestinian Lives)* (نیویارک: کولمبیا یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۹ء)، ۱۰۸۔

اصل متن:

> The central fact remains of course: We are a people without a land of our own. But for the first time in our history, one can see Palestinians as Palestinians in a sense producing themselves as they go about their work in a new environment of Palestinian self-consciousness affecting everyone. This self-production has had a noticeable effect. For the first time in its history, Zionism's policy of detail and its dramatic self-protection are faltering, and appear totally inadequate to account for the Palestinian presence.

Bibliography

Asad, Allama Muhammad. *Muhammad Asad: Bańda-i Ṣeḥrāī*. Lahore: Copra,2018.

Asad, Allama Muhammad. *Ṯūfān sē Sāḥil Tak*. Karachi: Majlis Nashriat-e-Islam,1997.

Chughtai, Muhammad Ikraam. *Muhammad Asad: Aik Europian Badvī*. Lahore: Copra, 2013.

David Gilmour. *Dispossessed: The Ordeal of the Palestinians*. London: Sphere Books, 1982.

Mehmood, Muhammad Asif. *Falasṯīn Bain al-Aqwāmī Qānūn kē Tanāzūr Maiṅ*. Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2024.

Michael Scott-Baumann. *Palastinians and Israelis: A Short History of Conflict*. Cornwall: The History Press, 2021.

Said, Edward. *After the Last Sky (Palestinian Lives)* New York: Columbia University Press, 1999.

———. *Mas'alah-i Falasṯīn*. Jehlam: Book Corner Jehlam, 2021.

———. *The End of the Peace Process: Oslo and After*. New York: Vintage Books, 2001.

———. *The Question of Palestine*. New York: Vintage Books: 1980

William V. Spanos. *The Legacy of Edward W. Said*. Illinois: University of Illinois Press, 2009.